کورس:اسلامیاتلازمی(5436) **سمسٹر:بہار:2021ء**

امتحانی مشق نمبر 2

سوال نمبر 1۔ عقیدہ آخرت سے کیا مراد ہے؟ قرآن اور حدیث کی روشنی میں مفصل نوٹ لکھیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ایمان یہ ہے کہ تم اللہ پر اور اس کے فرشتوں پر اور (آخرت میں) اللہ کے ملنے پر اور اللہ کے پیغمبروں پر ایمان لاؤ اور قیامت کا یقین کرو،

آخرت کا لفظ ایک جامع اصطلاح ہے

جس میں کئی طرح کے عقائد شامل ہیں مثلاً

(۱) مرنے پر انسان کی زندگی کا کلیتاً خاتمہ نہیں ہو جاتا۔ بلکہ مرنے کے بعد اسے دوبارہ زندہ کر کے اٹھایا جائے گا۔ پھر اس سے اس کے اعمال کا محاسبہ کیا جائے گا، لہذا وہ اس دنیا میں ایک غیر ذمہ دارانہ زندگی گزارنے کے لیے پیدا نہیں کیا گیا بلکہ وہ اپنے تمام اعمال کے لیے اللہ کے ہاں جواب دہ ہے

(۲) موجودہ نظام کائنات ابدی نہیں بلکہ ایک وقت آنے والا ہے جب یہ سب کچھ فنا ہو جائے گا۔ پھر اللہ تعالیٰ ایک دوسرا عالم پیدا فرمائے گا جس میں تمام فوت شدہ انسانوں کو دوبارہ پیدا کر کے اکٹھا کر دے گا اور فرداً فرداً ہر ایک سے اس کے اعمال کا محاسبہ کیا جائے گا۔

(۳) اس فیصلہ کے مطابق جو لوگ کامیاب قرار دیئے جائیں گے وہ جنت میں داخل ہوں گے اور نافرمان، کافر، مشرک وغیرہ دوزخ میں ڈالے جائیں گے۔

(۴) کامیابی و ناکامی کا اصلی معیار موجودہ زندگی کی خوشحالی و بدحالی نہیں ہے، بلکہ در حقیقت کامیاب انسان وہ ہے جو خدا کے آخری فیصلے میں کامیاب ٹھہرے ، اور ناکام وہ ہے جو وہاں ناکام ہو۔

ایمان بالآخرۃ، ایمان بالغیب کا اتنا اہم جزو ہے جو انسان کو زندگی کا دھارا بدلنے اور صراط مستقیم کی طرف آنے اور تقویٰ اختیار کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ اسی لیے اس کا ایمان بالغیب کے بعد علیحدہ طور پر بھی ذکر کر دیا گیا۔

عقائد کے اس مجمو عے پر جن لوگوں کو یقین نہ ہو وہ قرآن سے کوئی فائدہ نہیں اُٹھا سکتے، کیونکہ ان باتوں کا انکار تو درکنار، اگر کسی کے دل میں ان کی طرف سے شک اور تذبذب بھی ہو، تو وہ اس راستہ پر نہیں چل سکتا جو انسانی زندگی کے لیے قرآن نے تجویز کیا ہے۔

دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا گیا

(وَاِنَّ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَۃِ عَنِ الصِّرَاطِ لَنٰکِبُوْنَ ۔74) 23۔ المؤمنون:74)

یعنی جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے وہ قطعی اور یقینی طور پر سیدھی راہ سے بھٹکے ہوئے ہیں

، اور ظاہر ہے کہ جب وہ سیدھی راہ سے بھٹک گئے تو پھر ان کا سارا نظام حیات ہی غلط ہوگیا۔ والعیاذ باللہ العظیم من کل زیغ وضلال، وسوءٍ وانحراف،

عقیدہ کے لغوی معنی گرہ لگانااورپختہ عزم کرنے کے ہیں اوراصطلاح میں اللہ تعالی کی ذات و صفات پر پختہ یقین کرنے کے ہیں۔ حضرت محمدنے جن چھ باتوں پر ایمان لانے کی دعوت دی ہے ان میں پانچواں جز عقیدۂ آخرت ہے۔حضرت عمرؓسے مروی حدیث میں اس کی وضاحت ان الفاظ میں کی گئی ہے:

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم أن تومن باللہ،وملائکتہ، و کتبہ، و رسلہ، و الیوم الآخر وتومن بالقدر خیرہ و شرہ۔(مسلم:11)

’’رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایمان یہ ہے کہ تم اللہ کو، اس کے فرشتوں کو،اس کے رسولوں کو ،اور آخرت کو حق جانو اور مانواوراس بات کو بھی مانو کہ دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے اللہ تعالی کی طرف سے ہوتا ہے،چاہے وہ خیر ہو یا شر۔‘‘

عقیدہ آخرت کا مفہوم یہ ہے کہ انسان اس بات کا پختہ یقین رکھے کہ ایک دن لازماًایسا آئے گاجس میں تمام انسانوں کے اعمال کی جانچ پڑتال ہو گی ۔جیسا کہ آپؐ نے حضرت عائشہؓکے سوال کے جواب میں فرمایا:

من نوقش الحساب ہلک۔(مسلم:2878)

’’جس سے حساب لیا گیا وہ ہلاک ہوا ۔‘‘

دنیا کا موجودہ نظام ابدی نہیں ہے ،بلکہ ایک وقت مقررہ پر اس کا خاتمہ ناگزیر ہے۔فرمایا گیا:

أَفَحَسِبْتُمْ أَنَّمَا خَلَقْنَاكُمْ عَبَثاً وَأَنَّكُمْ إِلَيْنَا لَا تُرْجَعُون۔(المومنون: 115)

’’کیا تم نے یہ سمجھ رکھا تھا کہ ہم نے تمہیں فضول ہی پیدا کیا ہے اور تمہیں ہماری طرف کبھی پلٹنا ہی نہیں ہے؟‘‘

چناں چہ انسان اس حقیقت کو تسلیم کرے کہ اس دنیا کے خاتمے کے بعد اللہ تعالیٰ دوسرا عالم پیدا کرے گا اور ان کا محاسبہ کرے گا اور اس بات کا یقین رکھے کہ اللہ تعالی کے حساب و کتاب کے بعد جو نیک قرار پائیں گے وہ جنت میں جائیں گے اور جو برے اعمال کے ساتھ حاضر ہوں گے وہ دوزخ میں جائیں گے ۔اور یہی انسان کی کامیابی و ناکامی کا پیمانہ ہے ۔

آخرت کا مفہوم

آخرت سے مراد موت کے بعد کی زندگی ہے جسے حیاتِ آخرت بھی کہتے ہیں۔حیاتِ آخرت کے بارے میں عموماًتین طرح کے عقیدے پائے جاتے ہیں:

ٔدہریوں کے مطابق:

مرنے کے بعد انسان فنا ہو جائے گا اس کے بعد نہ ہی کوئی دوسری زندگی ہے اور نہ ہی جزا و سزا ،قرآن مجید نے ان کے اس عقیدہ کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے ۔

وَقَالُوا مَا ہِیَ إِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنْیَا نَمُوتُ وَنَحْیَا وَمَا یُہْلِکُنَا إِلَّا الدَّہْرُ وَمَا لَہُم بِذَلِکَ مِنْ عِلْمٍ إِنْ ہُمْ إِلَّا یَظُنُّونَ۔(الجاثیہ: 24)

’’یہ لوگ کہتے ہیں کہ زندگی بس یہی ہماری دنیا کی زندگی ہے،یہیں ہمارا جینا اور مرنا ہے اور گردشِ ایام کے سوا کوئی چیز نہیں جو ہمیں ہلاک کرتی ہو۔درحقیقت اس معاملے میں ان کے پاس کوئی علم نہیں ہے۔یہ محض گمان کی بنا پر یہ باتیں کرتے ہیں۔‘‘

ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

إِنَّ ہَؤُلَاء لَیَقُولُونَ۔إِنْ ہِیَ إِلَّا مَوْتَتُنَا الْأُولَی وَمَا نَحْنُ بِمُنشَرِیْنَ۔(الدخان: 34-35)

’’یہ لوگ تو یہی کہتے ہیں کہ (آخری چیز)یہی ہماری پہلی بار (دنیا سے) مر جانا ہے اور ہم دوبارہ اٹھائے نہیں جائیں گے ‘‘۔

اہلِ تناسخ کے نزدیک:

انسان اچھے یا برے اعمال کا بدلہ پانے کے لیے دنیا میں بار بار جنم لیتا رہے گا۔اچھے اعمال کے نتیجے میں عمدہ اوصاف اور اعلیٰ حیثیت کا مالک بن کر جنم لے گا اور اگر اعمال برے ہیں تو حیوانات و نباتات اور کیڑے مکوڑے کی شکل میں دنیا میں آئے گا ۔گویا ان کے نزدیک موت کے معنیٰ فنا نہیں، بلکہ تبدیلیِ جسم کے ہیں۔

افسوس کہ نوع انسانی کی کثیر تعداد آج اسی طرح کے باطل عقیدہ میں گرفتار ہے اور بے راہ روی اور ضلالت و گمراہی کی زندگی بسر کر رہی ہے۔جس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ آخرت کی زندگی کا عدم یقین زندگی کو بے لگام کردیتا ہے اور آخرت کی باز پرس کا احساس آزادانہ زندگی بسر کرنے کی آزادی سلب کر لیتا ہے۔ایسے ہی لوگوں کے لیے قرآن نے کہاہے:

بَلِ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَۃِ فِیْ الْعَذَابِ وَالضَّلَالِ الْبَعِیْد۔(السبا: 8)

’’(حقیقت یہ ہے کہ)آخرت پر یقین نہ رکھنے والے ہی عذاب میں اور دور کی گمراہی میں ہیں‘‘۔

انبیاء کے نزدیک :

جس کے ماننے والے اہلِ ایمان ہیں۔یہی وہ عقیدہ ہے جس کی درستگی ایمان کی تکمیل کرتی ہے۔یہ عقیدہ اپنے ماننے والوں پر حشر و نشر اور جزا و سزا کے یقین و تصدیق کو لازم کرتا ہے، جس کے سلسلے میں قرآن کہتا ہے:

يَوْمَ تُبَدَّلُ الأَرْضُ غَيْرَ الأَرْضِ وَالسَّمَاوَاتُ وَبَرَزُواْ للّهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ۔(ابراہیم: 48)

''ڈراؤ انہیں اس دن سے جب کہ زمین و آسمان بدل کر کچھ سے کچھ کر دیے جائیں گے اور سب کے سب اللہ واحد و قہار کے سامنے بے نقاب حاضر ہو جائیں گے۔''

میدان حشر میں پیشی:

اس وقت تمام لوگوں کی پیشی اللہ رب العزت کے سامنے ہو گی اور حال یہ ہو گا کہ اگر کوئی انسان چاہے گا کہ وہ اللہ کے سامنے حاضر نہ ہو اور زمین و آسمان کے کسی گوشے سے کہیں نکل بھاگے تو ایسا کوئی راستہ نہیں پائے گا اور اسے چاہے نہ چاہے اللہ تعالیٰ کے سامنے لا کھڑاکیا جائے گا ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

ما منکم من أحدالا سیکلمہ اللہ یوم القیامۃ لیس بین اللہ و بینہ ترجمان ۔(بخاری:6539)

''تم میں ہر فرد سے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس طرح کلام فرمائے گاکہ اللہ تعالیٰ اور بندے کے درمیان کوئی ترجمان نہ ہوگا۔''

یہ لمحہ ہمیں غور وفکر کی دعوت دیتا ہے کہ دنیا میں تو انسان اپنے حقوق کی وصولیابی کے لیے یا پھر دوسروں کے حقوق پر نا حق دست درازی کے لیے اپنے حمایتیوں کا سہارا لیتا ہے ،ا پنی پارٹی کے افراد اور ان کی قوت و استحکام پر نظر رکھتا ہے ، ضرورت پڑنے پر اپنے سفارشیوں کو لا کھڑا کرتا ہے اور کبھی اپنے مضبوط جتھے کے ساتھ طاقت کا مظاہرہ کرتا ہے، لیکن آخرت میں یہ سب کہاں؟بندہ ناچیز بے بس و مجبور تن تنہا حشر کے میدان میں اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضر ہو گا۔اسی لیے قرآن کریم نے انسانیت کو آ خرت کے اس مرحلے سے آگاہ کر دیا ہے اورفرمایا:

وَلَقَدْ جِءْتُمُونَا فُرَادَى كَمَا خَلَقْنَاكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ۔(الانعام:94)

''تم یقیناہمارے پاس تنہا ہی آؤ گے جس طرح ہم نے تم کو پہلی بار پیدا کیا تھا۔''

مطلب یہ کہ عقیدۂ آ خرت انسان کو اس تصور کے ساتھ زندگی گزارنے کی تعلیم دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے عدل و انصاف میں دنیاکی یہ ساری چیزیں کام آنے والی نہیں ہیں،بلکہ اللہ تعالیٰ کے

حضور ہر انسان کو بالکل یک و تنہا حاضر ہو کر حساب و کتاب چکانا ہوگا۔ یہ رشتہ داریاں اور آل و اولاد جن کی محبت انسان کو اکثر یاد خدا سے بھی غافل کر دیتی ہے اور کبھی نعوذ باللہ راہ حق سے موڑ کر باطل کی راہ پر ڈال دیتی ہیں، آخرت میں کچھ کام نہیں آئیں گی ۔اسی کو قرآن کہتا ہے:

لَن تَنفَعَكُمْ أَرْحَامُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ۔(الممتحنہ:3)

’’قیامت کے دن نہ تمہاری رشتہ داریاں کسی کام آئیں گی نہ تمہاری اولاد۔‘‘

ًبلکہ اس وقت ہر انسان کو صرف اپنا خیال ہوگا۔چناں چہ اس دن مجرم چاہے گاکہ اپنی اولاد،اپنی بیوی،اپنے بھائی،اپنی حمایت کرنے والے خاندان اور دنیا بھر کے لوگوں کو بھی اگر فدیہ میں دے کر عذاب سے چھو ٹ سکتا ہو تو انہیں بھینٹ چڑھا دے اور خود چھوٹ جائے۔‘‘ (المعارج:11،14)

معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی عدالت میں عزیز ترین رشتہ دار حتیٰ کہ آل و اولاد جن کے لیے والدین ہر طرح کی قربانی دیتے ہیں، جن کی آسائشوں و لذتوں کی تکمیل کے لیے اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی سے بھی غافل ہو جاتے ہیں وہ بھی آگے بڑھ کر یہ کہنے والے نہیں ہوں گے کہ انہوں نے فلاں فلاں گناہ کے کام ہمارے لیے کیے تھے اس لیے اس کی سزا ہمیں ہی دیدی جائے ، بلکہ وہ تو یہی چاہیں گے کہ اپنے گناہوں کی سزا کسی پر ڈالنے میں کامیاب ہو جائیں اور خود کو نجات دلا لیں ۔لیکن اللہ تعالیٰ کے یہاں ہر انسان کے لیے وہی کچھ ہو گا جو اس نے کمایا ہو گا، فرمایاگیا :

وَأَن لَّيْسَ لِلْإِنسَانِ إِلَّا مَا سَعَى۔وَأَنَّ سَعْيَهُ سَوْفَ يُرَى۔ثُمَّ يُجْزَاهُ الْجَزَاء الْأَوْفَى ۔(النجم:39-41)

’’ اور یہ کہ ہر انسان کے لیے صرف وہی ہے جس کی کوشش خود اس نے کی،اور یہ کہ اس کی کوشش عنقریب دیکھی جائے گی،پھر اسے پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔‘‘

یہ بدلہ ظاہر ہے انسان کے اعما ل کی نوعیت کے مطابق کما حقہ دیا جائے گا،نہ ہی کسی ہر بغیر اعمال صالحہ کے نوازشیں ہوں گی اور نہ ہی کسی پر ذرہ برابر ظلم ہو گا ۔اللہ تعالیٰ نے اس سلسلے میں انسان کو پہلے ہی متنبہ کر دیا ہے :

وَلِكُلٍّ دَرَجَاتٌ مِّمَّا عَمِلُواْ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُون۔(الانعام:132)

’’ہر ایک کے لیے ویسے ہی درجے ہوں گے جیسا انہوں نے کیا ہو گا اور تمہارا رب جو کچھ وہ کرتے ہیں اس سے غافل نہیں ہے‘‘۔

آیت اپنے ما قبل سے واضح کر رہی ہے کہ اس کے مخاطب جن و انس کے گروہ ہیں،جن کے پاس انبیاء اور رسولوں کی آ مد برابر ہوتی رہی ۔انبیاء انہیں اپنی بعثت کے مقصد سے آگاہ بھی کرتے رہے ،اس کے باوجود اگر ان کے اندر عقائد و اعمال کی خرابیاں و بگاڑ پیدا ہوا تو وہ اپنے جرائم کے اعتبار سے سزاؤں کے سزاوار ہوں گے اور ان کی بد اعمالیوں کے مطابق ان کی درجہ بندی کرکے انہیں جہنم رسید کیا جائے گا۔اس کے بر عکس جوعقائد و اعمال کی درستگی کے ساتھ حشر کے میدان میں قدم رکھے گا اورنیکیوں و بھلائیوں کا ذخیرہ اس کے ساتھ ہو گا، وہ اسی کے مطابق اجر و ثواب سے اپنا دامن بھر لے گا اور بحمداللہ اس کی عظیم تردائمی نعمتوں سے مالامال ہو گا ۔

انسان کو احساس ہونا چاہیے کہ درجہ بندی کرنے والی اور فیصلہ کرنے والی وہ ذات ہو گی جس کے پاس نہ صرف یہ کہ ہر انسان کا ریکاڈ موجود ہے بلکہ وہ بذاتِ خود بھی ہر فرد کے افعال پر بہت باریکی سے نظر رکھے ہوئے ہے ۔اس لیے اپنے عدل کے تقاضے کے مطا بق ا سی کے بقدرسزا سے دو چار کرے گا

سوال نمبر 2۔ زکوٰۃ اور حج کا مفہوم اور اہمیت پر نوٹ لکھیں۔

زکوۃ کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اسلام کی سب سے مقدم عبادت نماز کے بعد اس کا نمبر ہے۔ نماز شب معراج کو فرض ہوئی یعنی ہجرت سے ایک سال پہلے۔ (الدر المختار مع رد المختار ص 352 ج 1)

جبکہ زکوۃ 2 ھ کو فرض ہوئی (الدر المختار ص 256 ج 2) قرآن کریم میں نماز اور زکوۃ کو 82 مقامات پر ملا کر بیان کیا گیا ہے'' (ص 1 ایضاً) جس کی نظیر کسی اور حکم میں نہیں ملتی۔ اسلام ایسا نظام معاش قائم کرتا ہے جس سے قومی سرمایہ اوپر اوپر ہی نہ گھومتا رہے۔ ارشاد رب العزت ہے کہ

كَيْ لَا يَكُونَ دُولَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنكُمْ.

''تاکہ (سارا مال صرف) تمہارے مالداروں کے درمیان ہی نہ گردش کرتا رہے (بلکہ معاشرے کے تمام طبقات میں گردش کرے) ''۔ (الحشر، 59 : 7)

کیونکہ قومی سرمائے کی حیثیت تمام لوگوں کے لئے ایسی ہی ہے جیسے جسم کے لئے خون۔ اگر خون بعض حصوں کو پہنچے اور بعض محروم رہ جائیں تو وہ مفلوج ہو جائیں گے۔ یونہی قومی دولت اگر اوپر ہی اوپر چند طبقات میں گردش کرتی رہی تو قوم کی اکثریت عضوِ معطل

ہوکر رہ جائے گی۔ جس طرح جسم کا مفلوج حصہ اچھا نہیں ہوتا اور جسم پر بوجھ بن جاتا ہے، اسی طرح جب عوام پر قومی سرمایہ خرچ نہ ہوگا تو یہ بے زبان اکثریت معاشرے کے لئے وبال جان بن جائے گی۔ لہذا معاشرے کی خیریت اسی میں ہے کہ قومی دولت کی تقسیم مساویانہ طور پر کی جائے تاکہ معاشرے کے ہر فرد کو اس کی ضروریات بہم پہنچتی رہیں اور یہ خوبصورت دنیا کسی کے لئے جنت اور کسی کے لئے جہنم زار نہ بن جائے۔

اسلامی احکام کی برتری

آپ دنیا کی کسی تحریک کو دیکھ لیں۔ کسی مذہب کا مطالعہ کر لیں، روٹی کا مسئلہ کسی نے نہ نظر انداز کیا، نہ کیا جاسکتا ہے۔ اس لئے غریبوں، بیواؤں، یتیموں اور معذوروں کی مدد کرنے کا حکم ہر جگہ ہر ایک نے دیا اور دے رہے ہیں مگر جس انداز سے اس مسئلہ کو اسلام نے لیا ہے اور جس حکمت سے اسے حل کیا ہے وہ اسی کا خاصہ ہے۔ عام طور پر دوسروں کی مدد، ایک اخلاقی ہدایت تک محدود رکھی گئی ہے کہ کرنا چاہئے اچھی بات ہے مگر یہ اسلام کا امتیاز ہے کہ اس نے جو نظام حیات دیا اس میں نماز جیسی اہم ترین عبادت کے بعد زکوۃ کی صورت میں اس مسئلہ کو حل کردیا۔ مال وصول کریں اور محروم طبقات کو ضروریات مہیا کریں چنانچہ حکم ہوا :

خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِم بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ.

(التوبة، 9 : 103)

’’آپ ان کے اموال میں سے صدقہ (زکوٰۃ) وصول کیجئے کہ آپ اس (صدقہ) کے باعث انہیں (گناہوں سے) پاک فرما دیں اور انہیں (ایمان و مال کی پاکیزگی سے) برکت بخش دیں اور ان کے حق میں دعا فرمائیں‘‘۔

یہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم تھا۔ اب عام مسلمانوں کا فرض بھی ملاحظہ فرمایئے۔

الَّذِينَ إِن مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنكَرِ

(الحج : 41)

’’(یہ اہلِ حق) وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم انہیں زمین میں اقتدار دے دیں (تو) وہ نماز (کا نظام) قائم کریں اور زکوٰۃ کی ادائیگی (کا انتظام) کریں اور (پورے معاشرے میں نیکی اور) بھلائی کا حکم کریں اور (لوگوں کو) برائی سے روک دیں‘‘۔

اسلام کے دور اول میں جب اسلام مکمل طور پر ملکی قانون کے طور پر متمکن تھا نماز اور زکوۃ کا سسٹم بھی باقی قوانین و احکام کی طرح حکومت ہی قائم کرنے کی ضامن تھی۔ جب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن کا گورنر مقرر فرمایا تو ان کے ذمہ جو کام لگایا یہ تھا۔

ادعھم الی شھادۃ ان لا الہ الا اللہ وانی رسول اللہ فان ھم اطاعوا لذلک فاعلمھم ان اللہ افترض علیھم خمس صلوات فی کل یوم و لیلۃ. فان ھم اطاعوا لذلک فاعلمھم ان اللہ افترض علیھم صدقۃ فی اموالھم توخذ من اغنیائھم وترد فی فقرائھم.

’’ان کو اس گواہی دینے کی دعوت دو کہ اللہ کے سوا کوئی سچا معبود نہیں اور اس کی کہ میں اللہ کا (سچا آخری) رسول ہوں۔ پھر اگر وہ تمہاری یہ بات مان لیں تو ان کو بتانا کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر رات دن میں پانچ نمازیں فرض کی ہیں۔ پھر اگر وہ لوگ تمہاری یہ بات مان لیں تو ان کو بتاؤ کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے مالوں میں زکوۃ فرض کر دی ہے جو ان کے امیروں سے لے کر ان کے غریبوں پر صرف کی جائے گی‘‘۔ (صحیح بخاری ص 187 ج 1)

حج قولی، بدنی، قلبی، مالی عبادات کا مجموعہ ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی تعظیم اور بندی کی بندگی کا بے پناہ اظہار ہوتا ہے۔

حج کے لغوی معنی ارادہ کرنا کے ہیں۔

حج کے شرعی معنی : اسلام کے پانچویں رکن کی ادائیگی کے لیے بیت اللہ کے قصد کرنے کو حج کہتے ہیں۔

حج کا پس منظر:

سیدنا ابراہیم اور اسماعیل علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے سب خانہ کعبہ کی تعمیر فرمائی تو اس موقع پر انھوں نے مختلف دعائیں کیں جن میں سے ایک یہ تھی:

" اے ہمارے رب! ہمیں اپنا فرمانبردار بنا اور ہماری اولاد میں بھی فرمانبردار امت پیدا فرما اور ہمیں ہماری عبادت (مناسکِ حج) کے طریقے سکھلا اور ہماری توبہ قبول فرما، یقینا تو بہت زیادہ توبہ قبول کرنے والا، نہایت مہربان ہے۔"

(سورۂ البقرہ: 128)

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو یہ حکم دیا:

" اور لوگوں مین حج کی منادی کر دے، وہ تیرے پاس آئیں گے، پیدل اور دُبلے دُبلے اونٹوں پر، جو دور دراز کے راستوں سے چلے آئیں گے۔"

(سورۂ الحج: 27)

اس حکم کے بعد حج کا آغاز ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے خلیل سیدنا ابراہین، سیدہ ہاضر علیہ السلام اور ان کے فرزندِ ارجمند سیدنا اسمٰعیل علیہ السلام کی طرف سے کیے گئے بعض مخلصانہ اعمال کو شرف قبولیت سے نوازتے ہوئے قیامت تک کے لیے مناسک حج میں شامل فرما دیا۔ اللہ تعالیٰ کے اس حکم کی شان دیکھیے کہ دنیا کے کونے کونے سے عربی، عجمی، گورے ، کالے ، امیر، غریب، اعلٰی ، ادنٰی، آقا اور غلام لاکھوں کی تعداد میں ایک ہی لباس زیب تن کیے، ایک ہی طرح کےشعائر بجا لاتے ہوئے (لَبَّيْكَ اللَّهُمَّ لَبَّيْكَ) " میں حاضر ہوں، اے اللہ ! میں بار بار حاضر ہوں۔" کا تلبیہ پکارتے نظر آتے ہیں اور یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا۔ انشأ اللہ ۔

حج، اسلام کا ایک عظیم رکن:

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے۔1. اللہ تعالیٰ کی عحدانیت اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت کی شہادت دینا۔ 2. نماز قائم کرنا۔ 3. زکٰوۃ ادا کرنا۔ 4. حج کرنا۔ 5. رمضان کے روزے رکھنا۔"

(صحیح البخاری، الایمان، حدیث:8)

حج کی فرضیت:

ارشاد باری تعالٰی ہے:

" اور لوگوں پر اللہ تعالیٰ کا یہ حق ہے کہ جو اس (کعبہ) تک پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہو وہ اس کا حج کرے۔" (سورۂ اٰل عمران: 97)

استطاعت سے مراد راستے کا انتظام اور سواری کا انتظام ہے۔

(المستدرک للحاکم:442/1)

حج، زندگی میں صرف ایک مرتبہ فرض ہے:

ارکان اسلام میں حج ایک ایسا رکن ہے جو زندگی میں صرف ایک بار فرض ہے۔

(صحیح مسلم:الحج: حدیث:1337)

حج کی ادائیگی ہر صاحب استطاعت (مالدار)، عاقل، بالغ، مسلمان مرد و عورت پر اسی طرح فرض ہے جس طرح پانچوں وقت کی نمازیں، رمضان کے روزے اور صاحب نصاب شخص پر زکٰوۃ فرض ہے۔ ان سب کی فرضیت میں کوئی فرق نہیں۔

حج کی اہمیت:

حج کی اہمیت اس بات سے روزروشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ رب العالمین نے قرآن مجید میں اس کی فرضیت کو بیان کیا ہے اور ایک بڑی سورت کا نام "سورۃ الحج" رکھا ہے۔

سیدنا عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا:

" میں چاہتا ہوں کہ شہروں میں اپنے عُمّال بھیجوں، وہ جا کر جائزہ لیں اور ہر اس شخص پر جو استطاعت کے باوجود حج نہیں کرتا، جزیہ مقرر کریں کیونکہ یہ لوگ مسلمان نہیں۔"

(التلخیص الخبیر:223/2)

اسی طرح سنن بیہقی میں ہے کہ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تین بار فرمایا: " جو شخص وسعت اور پر امن راستے (استطاعت) کے باوجود حج نہیں کرتا اور مر جاتا ہے تو (اس کے لیے برابر ہے) چاہے وہ یہودی ہو کر مرے یا عیسائی ہو کر اور اگر استطاعت کے ہوتے ہوئے می نے حج نہ کیا ہو تو مجھے حج کرنا، چھ یا سات غزوات (میں شرکت کرنے) سے زیادہ پسند ہے۔"

(السنن الکبرٰی للبیھقی:334/4)

چنانچہ قرآن کریم کے الفاظ:"اور لوگوں پر خدا کا حق (یعنی فرض) ہے کہ جو اس گھر تک جانے کا مقدور رکھے وہ اس کا حج کرے اور جو اس حکم کی تعمیل نہ کرے گا تو خدا بھی اہلِ عالم سے بے نیاز ہے ۔" (سورۂ اٰل عمران: 97) سے بھی حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس اثر کی تائید ہوتی ہے کہ صاحب استطاعت شخص کا حج مں تساہل کرنا اس کو کفر تک پہنچا سکتا ہے۔

لٰہذا حج کی فرضیت و اہمیت اور سیدنا عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس فرمان کی روشنی میں اس بات کا جائزہ لینا چاہیے کہ اکثر وہ مسلمان جو سرمایہ دار، زمیندار اور بینک بیلنس رکھتے ہیں لیکن اسلام کے اس عظیم رکن کی ادائیگی میں بلا وجہ تاخیر کے مرتکب ہو

رہے ہیں ، انھیں چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے حضور فورا توبہ کریں اور پہلی فرصت میں اس فرض کو ادا کریں۔

حج کی فضیلت:

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"حج مبرور کا بدلہ صرف جنت ہے۔"

(صحیح البخاری، العمرۃ، حدیث:1773)

حج مبرور: وہ حج ہے جو مسنون طریقے اور شرعی تقاضوں کے عین مطابق کیا گیا ہو، اس میں کوئی شہوانی بات، گالی گلوچ اور لڑائی جھگڑا نہ کیا گیا ہو۔ ایک اور حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"جس شخص نے اللہ کے لیے حج کیا، (اس دوران میں) کوئی فحش گوئی کی نہ کوئی برا کام تو وہ گناہوں سے اس طرح پاک صاف واپس لوٹے گا جس طرح اس کی ماں نے اسے جنم دیا تھا"۔

(صحیح البخاری، الحج، حدیث: 1521

سوال نمبر 3۔ نبی کریم حضرت محمد رسول اللہ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وسلم نے تبلیغ کا آغاز کس طرح کیاجامع نوٹ لکھیں۔

نبوت ملنے کے تین سال بعد تک آپ خفیہ تبلیغ فرماتے رہے، جس کے نتیجے میں ۳۰ سے زائد افراد مسلمان ہوگئے، تین سال کے بعد آپ صلی اللہ علیہ و سلم نے اسلام کی تبلیغ علی الاعلان شروع کر دی، جس کے نتیجے میں کفار مکہ جو اس وقت بیت اللہ میں رکھے بتوں کو پوجا کرتے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جانی دشمن بن کر آپ اور آپ کے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم و صحابیات رضی اللہ تعالیٰ عنہن کو تکلیفیں پہنچانے لگے، ان کفار مکہ کے مظالم جب حد سے بڑھنے لگے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعثت کے پانچویں سال اپنے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم و دیگر اقارب کو جو تقریباً گیارہ مرد اور چار عورتوں پر مشتمل پندرہ افراد تھے، ملک حبشہ کی طرف ہجرت کر جانے کا حکم دیا(۵)۔ (تین ماہ بعد اس اطلاع پر کہ اہل مکہ نے اسلام قبول کر لیا ہے، ان میں سے کچھ افراد مکہ واپس آگئے، یہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ یہ اطلاع جھوٹی تھی) بعثت کے چھٹے سال حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی اسلام لے آئے(۶) تو لوگ اعلانیہ اسلام میں داخل ہونے لگے، اسلام کی روز بروز بڑھتی ہوئی شان سے خوفزدہ ہوکر کفار مکہ نے آپ

صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان بنی ہاشم اور بنی عبدالمطلب کے مکمل مقاطعہ کے لیے ایک عہدنامہ(۷) لکھ کر بیت اللہ میں لٹکا دیا، اس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم بعثت کے ساتویں سال ایک گھاٹی شعب ابی طالب میں اپنے تمام اقرباء ورفقاء سمیت مقید کر دیے گئے(۸)، ان سخت حالات میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو ایک مرتبہ پھر ملکِ حبشہ کی طرف ہجرت کے لیے فرمایا، جن میں تراسی مرد اور بارہ عورتیں شامل تھیں، تین سال بعد اس شدید محاصرے کا خاتمہ ہوا۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر تقریباً ۴۹ سال سات ماہ ہوئی تو ماہ شوال میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابوطالب وفات پاگئے اور اس کے صرف تین دن بعد ہی حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا بھی انتقال ہوگیا؛ اسی لیے آپ ... نے اس سال کو عام الحزن(غم کا سال) فرمایا۔

سفر معراج

اسی سال ماہ رجب کی ستائیسویں شب آپ صلی اللہ علیہ وسلم معراج کے سفر پر تشریف لے گئے(۹) اور اسی سفر میں پانچوں نمازیں فرض کی گئیں(۱۰)۔ جب اللہ تعالیٰ نے مدینہ میں اسلام کی اشاعت کا فیصلہ فرمالیا تو قبیلہ اویس کے چند آدمیوں کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے مکہ میں ملاقات ہوگئی اور ان میں سے دو آدمی اسعد بن زارده رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ذکوان بن عبد قیس رضی اللہ تعالیٰ عنہ مشرف باسلام ہوئے۔ بعثتِ نبوی کے گیارہویں سال کچھ اور آدمی مدینہ سے آکر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ملے اور ان میں سے تقریباً آٹھ افراد مسلمان ہوئے(۱۱)۔ بعثت نبوی کے بارہویں سال جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر ۵۲ سال تھی، ماہ ذوالحجہ میں جمرہ عقبہ کے قریب مدینہ سے آئے ہوئے تقریباً بارہ افراد نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کی، جسے بیعت عقبہ اولیٰ کہا جاتا ہے(۱۲)، اگلے سال جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم عمر کے تریپنوے سال میں تھے تو ماہ ذی الحجہ میں مدینہ طیبہ سے ایک بڑا قافلہ مکہ معظمہ پہنچا، جن میں ستر مرد اور دو عورتیں شامل تھیں(۱۳)۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نصف شب کے وقت جمرئہ عَقبہ کے قریب ان سے ملاقات کی، اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچاحضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی آپ کے ساتھ تھے جو اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ حضرت عباس رضی ا للہ تعالیٰ عنہ نے مدینہ سے آئے ہوئے ان حضرات سے مخاطب ہوتے ہوئے فرمایا: یہ میرا بھتیجا ہے جو ہمیشہ اپنی قوم میں عزت و حفاظت کے ساتھ رہا ہے، تم ان کو مدینہ لے جانا چاہتے ہو۔ اگر ان کے مخالفین سے ان کی

حفاظت کا ذمہ لے سکتے ہو تو ٹھیک ہے، ورنہ ان کو اپنے قبیلہ میں رہے دو۔ اس مدنی قافلہ کے سردار نے کہا کہ ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کا ذمہ لیتے ہیں، اے اللہ کے رسول اپنا دست مبارک دیجیے کہ ہم بیعت کریں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاتھ بڑھایا اور یہ سب لوگ بیعت نبوی سے مشرف ہوئے، اس بیعت کو بیعت عقبہ ثانیہ کہتے ہیں(۱۴)۔

ہجرت

پھر اسی سال آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ماہ صفر کی ستائیسویں شب کو مکہ سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ساتھ لیا اور روانہ ہوکر غار ثور پہنچے(۱۵) اور اس غار میں تین راتیں قیام کرنے کے بعد یکم ربیع الاوّل ایک ہجری (وہ زمانہ جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ کی طرف ہجرت سے شروع ہوا) بروز پیر(۱۶) جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر تقریباً باون سال گیارہ ماہ انیس دن تھی، مدینہ طیبہ روانہ ہوگئے، سات دن کے سفر کے بعد ۸/ربیع الاوّل سنہ ۱ھ مطابق ۲۳/ستمبر ۶۲۲ء بروز پیر آپ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ کے علاقے قبا پہنچے اور یہاں مسجد قبا کی بنیاد رکھی(۱۷)۔ ۱۲/ربیع الاوّل بروز جمعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم قبا سے سوار ہوکر بنی سالم کے گھروں تک پہنچے تھے کہ جمعہ کا وقت ہوگیا، یہاں تقریباً سو آدمیوں کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کا پہلا جمعہ پڑھایا(۱۸)۔ جمعہ سے فارغ ہوکر آپ یہاں سے روانہ ہوئے، جہاں اب مسجد نبوی ہے اس سے متصل حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا گھر تھا، یہاں آکر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی رک گئی، پھر آپ نے مستقل یہیں قیام فرمایا(۱۹)۔

مسجد، مدرسہ اور ازواجِ مطہرات کے حجروں کی تعمیر

مدینہ میں قیام کے بعد ماہ ربیع الاوّل میں ہی سب سے پہلے آپ نے مسجد نبوی(۲۰) اور ازواج(۲۱) مطہرات حضرت سودہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے لیے گھر تعمیرکرائے۔ جب مسجد نبوی کی تعمیر تقریباً مکمل ہوگئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار کو بلایا اور مکہ سے ہجرت کرکے آنے والے ۴۵مہاجرین اورا ن انصار مدینہ کے مابین مواخات قائم کرتے ہوئے ایک انصاری اور ایک مہاجر کو بلاکر فرماتے گئے کہ یہ اور تم بھائی بھائی(۲۲) ہو، اور پھر آپ نے اسی سال اسلام کا پہلا مدرسہ صفہ قائم فرمایا۔ صفہ سائبان کو کہتے ہیں، یہ سائبان مسجد نبوی کے ایک کنارے پر مسجد سے

ملا ہوا تیار کیا گیا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم جو دن بھر آپ سے احادیث سنتے تھے، رات کو یہیں آرام فرماتے(۲۳)۔

اسی سال آپ نے ایک منشور تیار کیا جس میں مہاجرین و انصاری کے علاوہ ان یہود و مشرکین کو بھی شامل کیا گیا جو اس وقت مدینہ میں آباد تھے، جس کا مقصد بلا امتیاز مذہب و قوم کے اندرونی و بیرونی خطرات سے نمٹنے کے لیے ایک اتحادی عمل کی ترویج تھی، اس معاہدہ کو میثاق مدینہ کہا جاتا ہے(۲۴) ، اسی سال ماہ شوال میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی (جن کا نکاح آپ سے پہلے ہوچکا تھا) رخصتی ہوئی(۲۵)۔ اس سال آپ نے دو سریّے روانہ فرمائے،سریہ جہاد کے اس دستے کو کہا جاتا ہے جس میں آپ نے خود شرکت نہ فرمائی ہو، بلکہ اپنے کسی صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اس دستے کا امیر مقرر کرکے روانہ فرمایا ہو، خواہ جنگ کی نوبت آئی ہو یا نہیں، نیز یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ دستہ جنگ ہی کی نیت سے روانہ کیا گیا ہو۔

غزوات اور دعوتی خطوط

۲ھ میں پانچ غزات ہوئے،غزوہ اس چھوٹے یا بڑے لشکر کو کہتے ہیں جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس شریک ہوئے ہوں، خواہ اس سفر میں جنگ کی نوبت آئی ہو یا نہ آئی ہو اور خواہ اس لشکر کے پیش نظر جنگ کے علاوہ کوئی اور مقصد ہو، غزوہ ابوأجس کو غزوہ ودان بھی کہتے ہیں۔ غزہ بواط، غزوہ بدر کبریٰ، غزہ بنی قینقاع، غزہ سوید۔ اس سال کے غزوات میں سب سے اہم غزوئہ بدر ہے جو رمضان(۲۶) المبارک کی ۱۸ تاریخ کو بدر کے مقام پر(جو مدینہ سے ۸۰ میل دور ہے) وقوع پذیر ہوا(۲۷)۔ اب تک مسلمان بیت المقدس کی طرف منہ کرکے نماز پڑھتے تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہش پرپندرہ شعبان ۲ھ نماز ظہر کے دوران اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ کی طرف مسلمانوں کو منہ کرکے نماز پڑھنے کا حکم فرمایا(۲۸)۔ اسی سال(۲۹)یکم رمضان المبارک کو روزے فرض کیے گئے اور آپ نے یکم شوال کو نماز عیدالفطر پڑھائی اور خطبہ عبدالفطر میں لوگوں کو صدقة الفطر(۳۰)کا حکم دیا۔

۳ھ میں تین غزوات ہوئے: غزوئہ غطفان، غزوئہ احد، غزہ حمرأالاسد ا(۳۱) اور دوسریّے روانہ ہوئے، غزوہ احد اس سال کا سب سے اہم غزوہ ہے جو ماہ شوال(۳۲) میں وقوع پذیر ہوا۔ ماہ شعبان میں حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا آپ کے نکاح میں آئیں اور اسی سال ماہ رمضان میں حضرت زینب بنت خزیمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بھی آپ کی منکوحہ(۳۳) بنیں۔

کعب بن اشرف یہودی کا خاتمہ(۳۴)، سود خوری کی حرمت کا ابتدائی حکم، شراب(۳۵) کی ابتدائی حرمت کا حکم، یتیموں اور زوجین کے حقوق سمیت وراثت کے مفصل قوانین کا نزول بھی اسی سال ہوا۔ ۴ھ میں دو غزوات پیش آئے: غزوہ بنی انضیر، غزوہ بدر صغریٰ اور چار سریّے روانہ کیے گئے(۳۶)۔ اس سال کے اوائل میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ حضرت زینب بنت خزیمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا (جو صرف چار ماہ قبل آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عقد میں آئی تھیں) انتقال فرماگئیں۔ یکم ذی القعدہ بروز جمعہ کو پردے کا حکم نازل ہوا، شراب کی قطعی حرمت کا حکم بھی اسی سال دیا گیا۔ نیز حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اسی سال ماہ جمادی الثانیہ میں آپ کے عقد میں آئیں(۳۷)۔

سنہ ۵ھ میں چار غزوات ہوئے: غزوہ ذات الرقاع، غزوہ دومتہ الجندل، غزوہ مریسیع(۳۸) جس کو غزوہ بنوالمصطلق بھی کہا جاتا ہے اور غزوئہ خندق جو زیادہ مشہور اور اہم ہے۔ غزوئہ بنوالمصطلق سے واپسی پر تیمم کا حکم نازل ہوا، اسی سال ماہ شعبان میں حضرت جویریہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عقد میں آئیں اور اسی سال حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ تعالیٰ بھی آپ کی منکوحہ بنیں۔

۶ھ میں تین غزوات پیش آئے، غزوہ بنی الحیان، غزوہ غابہ جس کو ذی قرہ بھی کہا جاتا ہے، غزوہ حدیبیہ جس کو صلح حدیبیہ بھی کہا جاتا ہے اور گیارہ سریّے بھی روانہ کیے گئے۔ اسی سال کے وسط میں حضرت ام حبیبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عقد میں آئیں اور اسی سال کے اواخر میں حضرت ماریہ قبطیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح فرمایا، حضرت خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی اسی سال مسلمان ہوئے(۳۹)اور نیز اس سال آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بادشاہوں کو دعوتی خطوط لکھ کر اپنے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے ذریعے ان تک پہنچائے(۴۰)۔ آپ نے وحیہ کلبی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ہرقل نامی بادشاہ روم کے پاس بھیجا، حضرت عبداللہ بن حذافہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو کسریٰ خسرو پرویز کج کلاہ ایران کی طرف روانہ فرمایا اور حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ تعالیٰ کو سلطان مصر واسکندریہ (مقوقس) کی طرف بھیجا اور عمرو بن عاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بادشاہان عمان یعنی جیفر اور عبداللہ کے پاس بھیجا۔

۷ھ میں صرف ایک غزوئہ خیبر ہوا اور پانچ سرایا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے روانہ فرمائے، غزوئہ خیبر کے بعد اس سال کے اوائل میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت صفیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے نکاح فرمایا(۴۱)اور اسی سال کے آخر میں حضرت میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عقد میں آئیں، اسی سال آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عمرہ کی جو صلح حدیبیہ میں چھوڑ دیا گیا تھا، قضاء فرمائی۔

۸ھ میں چار اہم غزوات پیش آئے۔ غزوہ موتہ، فتح مکہ، غزوہ حنین، غزوہ طائف اور دس سرایا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے روانہ فرمائے، ابوسفیان رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو اب تک مسلمانوں کے دشمن تھے، اس سال اسلام لے آئے(۴۲)۔

۹ھ میں غزوہ تبوک ہوا اور آپ نے تین سرایا روانہ کیے.... غزوئہ تبوک سے واپسی پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منافقین کی مسجد ضرار(جس میں جمع ہوکر وہ اسلام اور مسلمانون کے خلاف مشورہ کرتے تھے) کو آگ لگا دینے کا حکم دیا۔ اطراف عالم میں پھیلتی اسلام کی نشر و اشاعت سے متاثر ہوکر اس سال درج ذیل دفود قبولِ اسلام کی غرض سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش ہوئے: وفد ثقیف، وفد بنی فزارہ، وفط بنی تمیم، وفد کندہ، وفد بنی عبدالقیس، وفط بنی حنیفہ، وفد بنی قحطان، وفد بنی الحارث، نیز اسی سال عیسائیوں کا ایک وفد جو ساٹھ افراد پر مشتمل تھا، جسے وفد نجران کہا جاتا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے مدینہ میں ملا، یہ لوگ جب ایمان نہ لائے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں جزیہ ادا کرنے کا حکم دیتے ہوئے ان کے لیے ایک صلح نامہ تحریر فرمایا(۴۳)۔

۱۰ھ میں آپ صلی اللہ علیہ و سلم نے صرف دو سریّے روانہ فرمائے اور اسی سال ایک لاکھ سے زیادہ مسلمانوں کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع ادا فرمایا اور جو مسلمان اس سال حج میں نہیں تھے، ان کی تعداد اس سے کئی گنازیادہ تھی

سوال نمبر 4۔ اسلام کی اخلاقی اقدار اور اسلامی معاشرے کے بنیادی اوصاف پر نوٹ لکھیں۔

انسان کی مدنی زندگی اور اجتماعی زندگی کے لیے، تہذیب ایک فطری اور لابدی چیز ہے، دو آدمیوں کے باہمی ملاپ سے جو بچہ عالمِ وجود میں آتا ہے،اس کے پروان چڑھنے کے لیے ماں کی گود ضروری ہے، نیز اس کی نشونما کے لیے خاندان، معاشرہ اور تعلیم گاہ بھی ضروری ہے، مدنیت انسان کی فطرت ہے اور تہذیب اس کی اساس ہے، سویلائزیشن (تہذیب) کو آپ خواہ لفظی اعتبار سے دیکھیں خواہ تاریخی اعتبار سے اس کا مطالعہ کریں، ہر دو اعتبار سے اس کا

تعلق سماجی اور اجتماعی زندگی سے جڑا ہوا نظر آئے گا، عربی زبان میں اس کے لیے مدنیت، حضارت اور ثقافت جیسے الفاظ استعمال ہوتے ہیں اور انگریزی میں بھی Civic, City, Civil یہ سب Civilization کے مصدر کے طور پر مستعمل ہیں۔

تہذیب کیا ہے؟

یہ ایک ایسا گہوارہ ہے،جس میں انسانیت پروان چڑھتی ہے، انسان کا تشخص قائم ہوتا ہے، اس کے لیے ترقی کی راہیں وا ہوتی ہیں اور اس کو اپنا کر زندگی کے ہر موڑ پر انسان کامیاب وکامران ہوتا ہے۔ انسانوں کے درمیان خیالات، اقدار، ادارے، تعلقات اور نظام ہائے زندگی یہ سب اس کا نتیجہ ہیں۔

ثقافت اور تہذیب

ثقافت (کلچر) اور تہذیب (سویلائزیشن) کی اصطلاحیں عمرانیات (سوشیالوجی)، تاریخ اور فلسفے کے مباحث میں استعمال ہوتی ہیں؛ البتہ ان کی تکنیکی تعریف میں شدید اختلاف پایا جاتا ہے، نیز بعض دفعہ ان دونوں کو مترادف بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

عقیدے، اقدار اور اصولِ حیات کی بنیادی قدریں، جو کسی انسانی گروہ کی مشترک اساس ہوں اور جن کی بنیاد پر کسی قوم یا جماعت کو معاشرے میں ایک متمیز تشخص اور شناخت حاصل ہو، وہ کلچر کہلاتا ہے؛ لیکن واضح رہے کہ کلچر عقیدہ، فکر، عادات اور اخلاق واطوار کے ساتھ ساتھ سیاسی، اجتماعی اور معاشرتی اداروں؛ حتیٰ کہ بین الاقوامی میدانوں میں بھی اپنے آثار چھوڑتا ہے، جس کے نتیجے کے طور پر مختلف علوم وفنون وجودپذیر ہوتے ہیں، آرٹ کی متنوع شکلیں معرضِ ظہور میں آتی ہیں، فن تعمیر کے گوناگوں شاہ کار انسانی نگاہوں کو خیرہ کیے دیتے ہیں، معاشی ادارے تشکیل پاتے اور سیاسی نظام بنتے ہیں؛ اسی مجموعی تشخص کو تہذیب، حضارت اور سویلائزیشن کا نام دیا جاتا ہے اور علوم عُمرانی کی اصطلاح میں ایک کو Mentafacts (ذہنی تشکیل) کہا جاتا ہے اور دوسرے کو Artefacts (سماجی مظاہر) لیکن یہ دونوں باہم مربوط ہوتے ہیں اور ایک کا تصور دوسرے کے بدون غیرممکن ہے۔

تہذیب کے عناصرِ ترکیبی

کسی بھی تہذیب کے بنیادی طور پر چار عناصر ہوتے ہیں: (۱) اقتصادی ذرائع (۲) سیاسی نظام (۳) اخلاقی اقدار وروایات (۴) مختلف علوم وفنون پر گہری نظر، نیز جس

طرح کسی بھی تہذیب کے آگے بڑھنے اور ترقی کے منازل طے کرنے کے متعدد عوامل ہوتے ہیں: کچھ جغرافیائی، کچھ اقتصادی اور کچھ نفسیاتی جیسے: مذہب، زبان اور اصول تعلیم وتربیت، بالکل اسی طرح کسی بھی تہذیب کے نیرِ اقبال کے گہنانے کے بھی چند ایک اسباب ہوتے ہیں، جو اس کی بقا اور ترقی کی راہوں میں گامزن کرنے کے ذرائع سے معارض ہوتے ہیں مثلا: اخلاقی وفکری زبوں حالی، بدنظمی، ظلم وجور اور فقر وتنگدستی کا شیوع، مستقبل کے تئیں لاپروائی اور باصلاحیت راہ نما اور مخلص قائدین کی نایابی۔

تہذیبِ انسانی کی تاریخ

انسانی تہذیب کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے، جتنا قدیم اس خاک دان ارضی میں خود انسان کا وجود ہے ، دراصل یہ سلسلہ ایسا ہے جو اوّل دن سے تا امروز دراز ہے۔

تہذیبِ انسانی کا حیطۂ عمل

کسی بھی تہذیب کا تعلق کسی خاص خطۂ ارضی یا کسی خاص نسلِ انسانی سے نہیں ہوتا؛ بل کہ وہ تمام دنیا اور دنیا کی تمام نسلوں کو محیط ہوتی ہے؛ یہی وجہ ہے کہ دنیا میں ظہور پزیر ہونے والی ہر قوم تہذیب وتمدن کے باب میں کچھ نہ کچھ صفحات رقم کرتی ہے، گو بعض تہذیبیں اپنی ٹھوس بنیادیں، زبردست اثر انگیزی اورافادئہ عام کی بنا پر دیگر تہذیبوں سے ممتاز ہوجاتی ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ ہر وہ تہذیب جس کا پیغام عالم گیر ہو،جس کا خمیر انسانیت نوازی پر اٹھا ہو، جس کی ہدایات وتوجیہات اخلاقی قدروں کے پاسدار ہوں اور جس کے اصول وضوابط حقیقت پسندی پر مبنی ہوں؛ تاریخ میں ایسی تہذیب کو بقائے دوام حاصل ہوتی ہے، مرورِ ایام کے باوصف انسانی زبانیں اس کے ذکر میں سرگرم رہتی ہیں اور ہر زمانے میں اسے قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔

اسلامی تہذیب

اسلامی تہذیب بھی، انسانی تہذیبوں کے دراز سلسلہ کی ایک کڑی ہے، اس سے قبل بھی بہت سی تہذیبیں رونما ہوئیں اور اس کے بعد بھی تاقیامت ابھرتی رہیں گی۔

ہماری تہذیب کے ابھرنے، چمکنے اور عالم پر چھاجانے کے متعدد محرکات تھے اوراس کے گمنام وبے نشان ہونے کے بھی مختلف اسباب ہیں، جن کی تفصیل میں جانا ہمارے موضوع سے خارج ہے، ہمارا مقصد تو صرف انسانی ارتقاء کی تاریخ میں اسلامی تہذیب کے

عظیم الشان کردار اور دنیا کے مختلف اقوام پر علوم وفنون، عقائد، اخلاقیات، فلسفہ وحکمت اور ادب کے باب میں اس کے ناقابلِ فراموش احسانات کو ذکر کرنا ہے۔

اسلامی تہذیب کی خصوصیات

یوں تو اسلامی تہذیب اپنے جلو میں ہزارہا خوبیوں اور خصوصیات کو سموئے ہوئے ہے؛ مگر ہم صرف اس کی اہم، مرکزی اور بنیادی خصوصیات کو سپردِ قرطاس کریں گے اور ان شاء اللہ اسی سے تہذیبِ اسلامی کی تمام اگلی وپچھلی تہذیبوں پر برتری وبہتری عالم آشکارا ہوجائے گی۔

پہلی خصوصیت

اسلامی تہذیب کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی اساس کامل وحدانیت پر ہے، یہی ایک ایسی تہذیب ہے، جو یہ تصور پیش کرتی ہے کہ کائنات کی ایک ایک شئی صرف اور صرف ایک ذات کی خلق کردہ ہے،اسی کے لیے عبادت اور پرستش ہے اور اسی سے اپنی حاجات وضروریات بیان کرنا چاہیے (ایاک نعبد وایاک نستعین) وہی عزت عطا کرتا ہے اور اسی کے ہاتھ میں کسی کو بھی ذلیل وخوار کردینا ہے، وہی دیتا ہے اور وہی محروم بھی رکھتا ہے اور زمین کی بے کراں وسعتوں اور آسمان کی بے پایاں بلندیوں پر جو کچھ ہے سب اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ (وہو علی کل شيء قدیر)

عقیدے کے حوالے سے فکر کی اس بلند آہنگی کا طبقۂ انسانیت کو اونچا اٹھانے، عوام کو بادشاہوں، سربراہانِ مملکت، شہ زوروں اور مذہب کے اجارہ داروں کے جور وقہر سے نجات دلوانے، حاکم ومحکوم کے درمیان صدیوں سے پائی جانے والی خلا کو پاٹنے اور انسانی ذہنوں کو ایک مالک حقیقی، کائنات کے خالق اور عالمین کے حقیقی رب کی طرف پھیرنے میں زبردست اثر رہا، نیز اسی عقیدے کی وجہ سے اسلامی تہذیب گزشتہ تمام تہذیبوں میں نمایاں رہی اور آئندہ بھی اس کی انفرادیت باقی رہے گی (ان شاء اللہ)؛ کیونکہ اس کے عقیدے میں، طریقۂ جہاں بانی میں، علوم وفنون اور شعروادب میں غرضیکہ معاشرتِ انسانی کے ہر شعبے میں بت پرستی، اس کے آداب اور اس کی پیچیدہ روایات کی ادنیٰ جھلک بھی نہیں پائی جاتی۔

اسلامی تہذیب میں رومن لٹریچر کے ترجمے سے اعراض اور بت پرست یونان کے ادبی شہ پاروں سے پہلوتہی کاراز یہی ہے اور اسی وجہ سے ہماری تہذیب فن سنگ تراشی اور

صورت گری میں دیگر تہذیبوں سے علیحدہ رہی؛ جب کہ نقش ونگاری اور تعمیری مہارت میں اس کی نمائندگی قابل لحاظ ہے۔

اسلام ہی یکہ وتنہا ایسا مذہب ہے جس نے بت پرستی اور اس کے تمام تر مظاہر کے خلاف کھلے بندوں جنگ چھیڑی اور بت پرستی کی ہر جھلک اور اس کے باقیات پر خط نسخ پھیر ڈالا، مثلاً: انبیاء، اولیاء، اصحابِ علم وفضل اور فاتحین کی تصویریں بہ طور یادگار رکھنے کو منع کیا، واضح رہے کہ یہ رسم قدیم وجدید ہر دوتہذیب میں رواجِ عام رکھتا ہے؛ اس لیے کہ ان تہذیبوں میں خدائے واحد کے حوالے سے وہ تصور مفقود ہے جو اسلامی تہذیب نے پیش کیا ہے۔

پھر اسی عقیدئہ وحدانیت کے زیر اثر وہ تمام قواعد وضوابطِ حیات وجود پزیر ہوئے جن پر اسلامی تہذیب مشتمل ہے؛ چنانچہ اس کے پیغام اس کے قوانینِ تشریعی، اس کے مقاصد واہداف، اس کے ذرائعِ معیشت اور طرز ہائے فکر، ہر ایک میں وحدت کا رنگ غالب ہے۔

دوسری خصوصیت

اسلامی تہذیب کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس کے اہداف اور پیغامات تمام کے تمام آفاقی ہیں، ارشاد ربانی ہے: یَا اَیُّھَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنَاکُمْ مِنْ ذَکَرٍ وَّاُنْثٰی وَجَعَلْنَاکُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللہِ اَتْقَاکُمْ (حجرات:۱۳) قرآن کریم نے تمام عالم کے انسانوں کو حق، بھلائی اور خلقی شرافت وکرامت کی بنیاد پر ایک کنبہ قرار دیا، پھر اس نے اپنی لائی ہوئی تہذیب کو ایک قلادے کے درجہ میں رکھا، جس میں ان تمام قبائل واقوام کے عمدہ گراں مایہ جواہر کو پرودیا جنھوں نے مذہب اسلام قبول کیا، پھر اس کی اشاعت و ترویج میں کوشاں رہے، یہی وجہ ہے کہ دیگر تمام تہذیبیں کسی ایک نسل اور قوم کے مردانِ کارپرناز کرتی ہیں، مگر تہذیبِ اسلامی میں وہ تمام افراد مایۂ افتخار ہیں، جنھوں نے اس کے قصر عظمت کو بلند کیا؛ چنانچہ ابوحنیفہؒ، شافعیؒ، واحمدؒ، خلیلؒ وسیبویہؒ، کندیؒ وغزالیؒ اور فارابی وابن رشدؒ (جن کی نسلیں بھی مختلف تھیں اور جائے سکونت بھی الگ) کے ذریعہ اسلامی تہذیب نے پورے عالم کو انسانی فکر سلیم کے عمدہ نتائج سے ہم کنار کیا۔

تیسری خصوصیت

اسلامی تہذیب کی تیسری اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس نے اعلیٰ اخلاقی قدروں کو اپنے تمام ضابطہ ہائے حیات اور زندگی کی سرگرمیوں میں اولیت کا مقام عطا کیا اور ان قدروں سے

کبھی بھی خالی نہ رہی؛ چنانچہ علم وحکمت، قوانین شرعیہ، جنگ، مصالحت، اقتصادیات اور خاندانی نظام، ہر ایک میں ان کی قانوناً بھی رعایت کی گئی اور عملاً بھی اوراس معاملے میں بھی اسلامی تہذیب کا پلڑا تمام جدید وقدیم تہذیبوں پر بھاری نظر آتا ہے؛ کیونکہ اس میدان میں ہماری تہذیب نے قابل فخر آثار چھوڑے ہیں اور دیگر تمام تہذیبوں سے انسانیت نوازی میں سبقت لے گئی ہے۔

چوتھی خصوصیت

ہماری تہذیب کی چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے سچے اصولوں پر مبنی علم کو خوش آمدید کہا اور پکے مبادیات پر مبنی عقائد کو اپنی توجہ کا مرکز قرار دیا؛ چنانچہ عقل وقلب دونوں اس کے مخاطب ہیں اور فکر وشعور دونوں اس کی جولان گاہ اور یہ بھی تہذیبِ اسلامی کی ایسی خصوصیت ہے جس میں پوری انسانی تاریخ میں اس کا کوئی سہیم وشریک نظر نہیں آتا، اس کے باعثِ افتخار ہونے کا راز یہ ہے کہ اسی کے ذریعہ سے اسلامی تہذیب نے ایسا نظام حکومت قائم کیا جو حق وانصاف پر مبنی ہو اور دین وعقیدے کی پختگی جس کا محور ہو، ایسا نہیں کیاکہ دین کو حکومت اور تہذیب کی ترقیات سے الگ رکھے؛ بل کہ ہر قسم کی ترقی میں دین کو اہم عامل کی حیثیت حاصل رہی؛ چنانچہ بغداد، دمشق، قاہرہ، قرطبہ اور غرناطہ کے منارہ ہائے مسجد سے علم ودانش کی کرنیں پھوٹیں اور عالم کے گوشے گوشے کو منور کرگئیں، اسلامی تہذیب تنہا ایسی تہذیب ہے جس میں دین وسیاست کا امتزاج بھی رہا؛ مگر وہ اس امتزاج کی زیاں کاریوں سے یکسر محفوظ رہی، حکمراں، خلیفہ اور امیر المومنین ہوا کرتا تھا؛ لیکن فیصلہ ہمہ دم حق کے موافق ہوتا، شرعی فتاوے وہی لوگ صادر کرتے جو فقہ وفتاویٰ پر اتھارٹی ہوتے اور ہرکہ ومہ قانون اور فیصلے کے سامنے برابر ہوتا، کسی کو کسی پر وجہ امتیاز حاصل نہ ہوتی سوائے تقویٰ اور لوگوں کی عام نفع رسانی کے، نبی پاکﷺ کا ارشاد ہے: ''وَاللهِ لَو اَنَّ فاطمۃَ بنتَ محمدٍ سَرِقَتْ لَقَطَعَ محمدٌ یدَھا''(رواہ الشیخان) دوسری جگہ فرمایا: ''الخلقُ کلُّھم عِیالُ اللهِ فأحبُھم إلیہ أنفعُھم لِعِیالہ'' (رواہ البخاری) اس مذہب پر ہماری تہذیب کی اساس ہے، جس میں عام طبقۂ انسانی پر نہ تو کسی حکمراں کو کوئی برتری حاصل ہے، نہ کسی عالمِ شریعت کو، نہ کسی اعلیٰ نسب والے کو اور نا ہی تونگر وزورآور کو (قُل إنَّما أنا بشرٌ مِثْلُکُمْ)

پانچویں خصوصیت

ہماری تہذیب کی ایک اور اہم ترین خصوصیت اس کی کشادہ ظرفی اور انتہا سے زیادہ مسامحت ہے، جو مذہب کی بنیاد پر قائم کسی بھی تہذیب میں ناپید ہے۔ کسی ایسے شخص کا جو نہ کسی مذہب کا پیرو ہو اور نہ کسی معبود کی پرستش کرتا ہو، تمام مذاہبِ عالم کو ایک نگاہ سے دیکھنا اور ان کے اَتباع کے ساتھ معاملۂ عدل کرنا، کوئی تعجب خیز امر نہیں ہے؛ لیکن ایک ایسا شخص جس کو اپنے دین کے برحق اور اپنے عقیدے کے مبنی بر صحت ہونے کا کامل یقین ہو، پھر اسے شمشیربہ کف ہونے، اقطارِ عالم کو فتح کرنے، ان پر حکومت کرنے اور وہاں کے باشندوں کی قسمت کا فیصلہ کرنے کا بھی موقع ملے؛ مگر اپنے دین کی حقانیت وصحت اسے فیصلے میں ظلم وجور کرنے، یا عدالت کی راہوں سے منحرف ہونے یا لوگوں کو اپنے دین کے سامنے سرِ تسلیم خم کردینے پر مجبور کرنے پر برانگیختہ نہ کرے، تاریخ میں ایسا شخص یقینا عجیب وغریب ہی شمار کیاجائے گا۔

خیر یہ تو کسی ایک شخص کی بات ہے ؛ مگر ہماری تو پوری تہذیب کی بنیاد ہی مذہب اور اس کے وضع کردہ اصولوں پر ہے؛ لیکن یہ ایک ناقابل انکار سچائی ہے کہ تاریخ میں سب سے زیادہ مسامحت، انصاف، رحم وکرم اور انسانیت کی علمبردار صرف اور صرف ہماری تہذیب ہے اور ہمارے لیے یہ موجبِ صد افتخار ہے کہ ہماری تہذیب کا قِوام صرف ایک مذہب پر ہے؛ مگر اس کی لامحدود وسعتوں میں مذاہبِ عالم کی تہذیب کی سمائی ممکن ہے۔

عالمی تہذیبوں کی تاریخ میں ہماری تہذیب کی یہ چند امتیازی خصوصیات ہیں، جب دنیا حکومت وسلطنت، علم وحکمت اور قیادت وسیادت ہر میدان میں ہمارے زیر نگیں تھی، تو انھیں خصوصیات کی بنا پر ہماری تہذیب ہر قوم ومذہب کے باشعور اور ذہنِ رسا رکھنے والے افراد کے قلوب کو اپنی طرف متوجہ کرلیتی تھی؛ لیکن جب اس کا زور جاتا رہا، اس کو گلے لگانے والے اپنی سیہ کاریوں کی وجہ سے پسماندگی کا شکار ہوگئے اور اس کے بالمقابل دوسری تہذیبیں رونما ہوئیں، تو ہماری تہذیب کی قدر وقیمت پر دنیا کی نگاہیں مختلف انداز سے اٹھنے لگیں؛ چنانچہ کچھ لوگ اس کی ہرزہ سرائی کرنے لگے، تو کچھ مدح سرائی اور کچھ لوگ اس کے فضائل شما رکرانے لگے تو کچھ لوگ اس کے رذائل؛ غرضیکہ جتنے منھ اتنی باتیں۔

ایسا کیوں ہوا؟

اگر تہذیبوں کو پرکھنے کا آلہ فرمانروایانِ مغرب کے ہاتھوں میں نہ ہوتا اور وہ دنیا کی رنگا رنگ طاقت وقوت کے مالک نہ ہوتے، تو وہ کبھی بھی اس دریدہ دہنی کی جرأت نہ

کرسکتے تھے؛ کیونکہ دنیا کا یہ اصول ہے کہ جب کوئی قوم اور اس کی تہذیب وتمدن کسی دوسری قوم کے زیر تسلط ہوتی ہے، تو وہ قوم اپنے تئیں انتہائی ناتواں اور کمزور ہوجاتی ہے اور اس پر فتح یاب قوم پورے نادیدے پن کے ساتھ اس کے منافع پر ہاتھ صاف کرتی اور ان پر حکومت کرتی ہے اور یہ بھی زمانے کا دستور رہا ہے کہ طاقت ور کمزور کی تحقیر وتنقیص کرتا ہے اور ہمہ دن اس کو ذلیل وخوار کرتا رہتا ہے؛ چنانچہ تہذیبِ جدید کے علمبرداروں نے مسلمانوں اور اسلامی تہذیب کے ساتھ اسی روایت کو دہرایا اور دہرارہے ہیں۔

حالانکہ تاریخ شاہد ہے کہ جب خطہ ہائے عالم پر ہماری فتح مندی کے پرچم لہرارہے تھے اور ہم دنیا کے سوپر پاور کی حیثیت میں تھے، تو ہم نے کمزور وشہ زور کے ساتھ انصاف کیا اور ہر صاحب فضل وکمال کے رتبے کو پہچانا اوراسے اس کے لائق مقام ومرتبہ عطا کیا، خواہ وہ دنیا کے مغربی خطے کا ہو یا مشرقی خطے کا اور حقیقت یہ ہے کہ تاریخ انسانی ہم جیسا منصف اور عدل گستر حکمراں اور پاکباز وصاف دل انسان پیش کرنے سے قاصر اور درماندہ ہے۔

لمحۂ فکریہ

قابل افسوس امریہ ہے کہ ہم اب تک بہ تمام وجوہ نہ سمجھ پائے کہ دنیا کی طاقت ور قومیں ہمارے خلاف کتنا متعصبانہ رویہ رکھتی ہیں اور کس طرح ہماری روشن اور بے غبار تہذیب کو اپنے ظلم وتعدی کا نشانہ بناتی ہیں، ان میں سے بہت سے افراد تو وہ ہیں جو اپنے دین کے تئیں عصبیت بے جا کے شکار ہیں اور ان کے دیدے حق بینی سے محروم ہوچکے ہیں اور کچھ ایسے بھی ہیں، جو قومی عصبیت میں مبتلا ہیں اور قومیت کے کبر وفخر کی وجہ سے وہ دوسری قوم کے فضل وکمال کا اعتراف نہیں کرنا چاہتے؛ لیکن اُس وقت ہمیں مہر بہ لب ہونا پڑتا ہے اور ہمارے پاس کوئی عذر نہیں ہوتا، جب ہم مسلمانوں ہی میں سے بعض سرپھروں کو دانایانِ فرنگ کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے دیکھتے ہیں اور ہم سے اس سوال کا کوئی جواب نہیں بن پڑتا کہ آخر چند ایک فرزندانِ اسلام بھی اس اسلامی تہذیب کی تحقیر کرتے ہوئے کیوں نظر آتے ہیں، جس کے سامنے دنیا نے صدیوں اپنے گھٹنے ٹیکے رکھے تھے؟

تہذیبِ اسلامی کا استخفاف کرنے والے ان نام نہاد مسلمانوں کا جواب شاید یہ ہو کہ تہذیبِ نو کے نقوش، جدید علوم کی دنیا میں اس کی نت نئی ایجادات اور فتوحات کے مقابلے میں

ہماری تہذیب ہیچ ہے؛ لیکن ان کا یہ جواب کسی حد تک درست ہوتب بھی دو وجہوں سے اسلامی تہذیب کا استخفاف کسی بھی طرح درست نہیں ہوسکتا۔

پہلی وجہ

یہ ہے کہ ہر تہذیب کے دو عنصر ہوتے ہیں: ایک اخلاقی، دوسرا مادی، جہاں تک مادی عنصر کی بات ہے، تو اس سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا کہ ہر بعد کی تہذیب پہلے کی تہذیب سے اس باب میں سبقت رکھتی ہے، زندگی اور اس کے وسائل کی ترقی کے حوالے سے سنت اللہ یہی رہی ہے؛ لہذا تہذیبِ گزشتہ سے ان ترقیات کا مطالبہ کرنا، جو تہذیبِ حاضر کو حاصل ہیں فعل عبث ہے اوراگر یہ درست ہوتو، پھر ہمارے لیے اس بات کی پوری گنجائش ہے کہ ہم اسلامی تہذیب کے پیدا کردہ ان وسائلِ معیشت اور مظاہرِ تمدن کے باب میں جوگزری ہوئی تمام تہذیبوں میں نابود تھیں، ان کی تحقیر و تنقیص کریں؛ لہٰذا اس صداقت کو تسلیم کرلینا چاہئے کہ دنیا کی تہذیبوں کے مابین فرق مراتب کے لیے مادی عنصر کو کبھی بھی بنیاد قرار نہیں دیا جاسکتا۔

رہا اخلاقی عنصر، تو حقیقت یہ ہے کہ یہی عنصر تہذیبوں کو حیاتِ جاوداں عطا کرتا ہے اور اسی کو اپنا کر کوئی بھی تہذیب انسانیت کو خوش بختی سے ہم کنار کرنے اور اسے زندگی کے مصائب اور ہلاکت کے اندیشوں سے نجات دلانے کا فریضہ انجام دے سکتی ہے اوراس میدان میں ہماری تہذیب تمام تہذیبِ رفتہ وآئندہ پر سبقت رکھتی ہے اور کامیابی کی اس معراج پر پہنچی ہوئی ہے کہ تاریخ کے کسی بھی موڑ پر اس کی نظیر نایاب ہے اور ہماری تہذیب کو خلود بخشنے کے لیے کافی ہے؛ کیونکہ کسی بھی تہذیب کا آخری مقصد یہی ہوتا ہے کہ وہ انسانیت کی سعادت کا ہر ممکن سامان فراہم کرے اوریہ کام ہماری تہذیب نے ایسے احسن واکمل طریقے پر انجام دیے ہیں کہ شرق وغرب اور شمال وجنوب کی کوئی بھی تہذیب اس کے عشر عشیر کو بھی نہ پہنچ سکی۔

دوسری وجہ

ان مغرب زدہ ذہنوں کے جواب کے لچر اورنامعقول ہونے اوراس کی بنا پر اسلامی تہذیب کی تحقیر کے درست نہ ہونے کا دوسرا سبب یہ ہے کہ تہذیبوں کے درمیان تقابل کے لیے نہ تو مادی پیمانہ اختیار کرنا چاہیے، نہ کم وکیف اور عدد ومساحت کو معیار بنانا چاہیے اور نا

ہی خوراک وپوشاک ومعاش کو؛ بل کہ ان کے درمیان تقابل ان کے آثار کے ذریعہ کیا جانا چاہیے، جو انسانی تاریخ میں اس تہذیب کی باقیات ہیں۔

تہذیبوں کے درمیان تقابل ایسا ہی ہے جیسے مختلف ملکوں اور حکومتوں کے درمیان باہمی آویزش؛ چنانچہ ان کے درمیان مقابلہ حدود مملکت کی وسعت اور شہریوں اور افواج کی تعداد سے نہیں ہوتا؛ یہی وجہ ہے کہ قرونِ قدیمہ ووسطیٰ کی فیصلہ کن جنگوں کو لشکر اور آلاتِ حرب کے اعتبار سے اگر دوسری عالم گیر جنگ پر قیاس کیا جائے، تو گزشتہ جنگیں بالکل ہیچ معلوم ہونگی؛ لیکن اس کے باوجود ان جنگوں کو اپنے دور رس نتائج کی وجہ سے تاریخ میں غیرمعمولی اہمیت حاصل ہے۔

چنانچہ تاریخ کی مشہور زمانہ جنگ جس میں قرطاجنی (Carthajion) سپہ سالار ''ہنیبال'' نے رومیوں کو شرمناک شکست دی تھی، اس کے واقعات اب بھی یورپ کی تعلیم گاہوں میں زیر تدریس ہیں، اسی طرح حضرت خالد بن ولیدؓ کی شام کی فتوحاتی مہم کے معرکے تاہنوز مغربی ماہرینِ جنگ کی تحقیق کا میدان اور ان کی حیرت وتعجب کا باعث ہیں، نیز یہ معرکے ہماری تہذیب کی جنگی فتوحات کی تاریخ کے سنہرے صفحات کی حیثیت رکھتے ہیں۔

سوال نمبر 5۔ مسلمانوں کی علمی خدمات پر جامع نوٹ لکھیں۔

موجودہ دور میں مسلمانوں کے درمیان تعلیم کے دو دھارے جاری ہیں۔ ایک کو قدیم یا دینی کہا جاتا ہے اور دوسرے کو جدید یا عصری۔یہ دونوں دھار ے متوازی چلتے ہیں اور جس طرح دریا کے دونوں کنارے طویل ترین فاصلہ طے کرنے کے با وجود کہیں نہیں ملتے، اسی طرح اِن دونوں دھاروں کے درمیان بھی کہیں یکجائی نہیں ہوتی۔ والدین کو ابتدا ہی میں فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ وہ اپنے بچے کو کسی دینی مکتب یا مدرسے کے حوالے کریں یا کسی اسکول میں اس کا داخلہ کرائیں۔ جدید تعلیم حاصل کرنے والا بچہ ڈاکٹر، انجینیئر، آرکیٹیکٹ یا کسی پروفیشن کا ماہر تو بن جاتا ہے لیکن اس کی دینی تعلیم واجبی سے بھی کم ہوپاتی ہے۔ دوسری طرف مدرسے سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والا عالم و فاضل ہو کر مسجد کی امامت اور مدرسے کی مسند ِصدارت سنبھالنے کے قابل تو ہو جاتا ہے لیکن تیز رفتار ترقیات سے معمور دنیا میں وہ خود کو اجنبی محسوس کرتا ہے، چنانچہ احساس کم تری کا شکار ہو جاتا ہے۔

اس صورتحال میں کئی سوالات ابھرتے ہیں۔ کیا تعلیم کی یہ تقسیم دینی اعتبار سے درست ہے؟ کیا ایک صالح، کار آمد اور انسانیت کے لئے مفید معاشرہ کی تعمیر کے لئے اس تقسیم کو نہ صرف گوارا بلکہ باقی رکھنے کی کوشش کرنی چاہیے؟ اور سب سے بڑا سوال یہ کہ کیا مسلمانوں نے اپنے دورِ عروج میں اس تقسیم کو روا رکھا تھااور کیا انھوں نے مسلم بچوں اور بچیوں کے لئے دینی تعلیم کا الگ انتظام کیا تھا؟

اسلام علم کو' 'دینی'' اور ''دنیاوی'' خانوں میں باٹنے کا قائل نہیں۔ بنیادی دینی تعلیم، جس کے ذریعہ انسان دین کے تقاضوں پر عمل کر سکے، اسے اس نے ہر مسلمان کے لئے لازم قرار دیا ہے(طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم۔ابن ماجہ) اس کے بعد علم و معرفت کے تمام دروازے ہر شخص کے لئے کھلے ہوئے ہیں۔ وہ اپنی طلب، مواقع اور محنت کے مطابق ان سے فیض حاصل کر سکتا ہے۔ آج جن علوم کو خالص دینی علوم کہا جاتا ہے۔اگر کوئی شخص انھیں اس لئے حاصل کرتا ہے کہ ان کے ذریعہ دنیا کمائے، سماج میں اونچی پوزیشن حاصل کرے اور لوگ اس کے علم و فضل کے قصیدے پڑھیں تو اللہ کے رسول نے ایسے شخص کو وعید سنائی ہے اور فرمایا ہے کہ وہ جنت سے اتنا دور ہوگا کہ اسے اس کی خوشبو بھی نہ آسکے گی حالانکہ اس کی خوشبو میلوں دور سے محسوس ہوگی (من تعلّم علماً مماّ یبتغی بہ وجہ اللہ لا یتعلّمہ الا لیصیب بہ عرضاً من الدنیا، لم یجد عرف الجنۃ۔ابوداؤد)۔اس کے بر عکس آج جن علوم کو خالص دنیاوی علوم سمجھا جاتا ہے، اگر کوئی شخص انھیں اس لئے حاصل کرتا ہے کہ اس پر معرفتِ خدا وندی کے اسرار کھلیں اور وہ ان کے ذریعہ خلقِ خدا کو فائدہ پہنچائے تو وہ اس پر ضرور بارگاہ الٰہی میں اجر و انعام کا مستحق ہوگا اور اس کا ٹھکانہ جنت میں ہوگا۔ قرآن کریم کی ایک آیت ہے :'' حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے بندوں میں سے صرف علم رکھنے والے لوگ ہی اس سے ڈرتے ہیں''۔(فاطر28)۔

اس آیت میں' 'خشیت الٰہی ''سے بہرہ ور ہونے کا سہرا ''علماء '' کے سر باندھا گیا ہے لیکن کون سے ''علماء '' ؟ محض روایتی، قدیم، دینی علوم کے فیض یافتگان نہیں بلکہ تمام علوم سے شغف رکھنے والے لوگ۔ اس آیت سے متصل اس کا نصف اول ٹکڑا اور اس سے پہلے کی آیت ملاحظہ کیجیے :'' کیا تم دیکھتے نہیں ہوکہ اللہ آسمان سے پانی برساتا ہے اور پھر اس کے ذریعے سے ہم طرح طرح کے پھل نکال لاتے ہیں، جن کے رنگ مختلف ہوتے ہیں اور پہاڑوں

میں بھی سفید، سرخ اور گہری سیاہ دھاریاں پائی جاتی ہیں، جن کے رنگ مختلف ہوتے ہیں اور اسی طرح انسانوں اور جانوروں اور مویشیوں کے رنگ بھی مختلف ہیں۔''(فاطر 28,27)۔
دیکھا جائے تو ان آیات میں علم موسمیات ،علم نباتات، علم طبقات الارض،علم بشریات اور علم حیوانات کی طرف اشارے موجود ہیں اور ان تمام کا شمار موجودہ اصطلاحات کے اعتبار سے جدید علوم میں ہوتا ہے۔

تعلیم گاہ کی خشتِ اول مسجد نبوی میں بنے ہوئے چبوترے پر رکھی گئی تھی، جسے ہم ''صفہ '' کے نام سے جانتے ہیں۔ وہاں بھی علم کی جامعیت کا تصور پیش کیا گیاتھا۔ اصحاب صفہ نہ صرف قرآن حفظ کرتے اور اللہ کے رسول کے ارشادات کو سن کر اپنے سینوں میں محفوظ کرتے تھے بلکہ لکھنا پڑھنا بھی سیکھتے اور فنونِ حرب کی بھی مشق کرتے تھے۔ غزوۂ بدر کے موقع پر جن سردارانِ مکہ کو گرفتار کیا گیا تھا ان کا فدیہ یہ قرار دیا گیا تھا کہ ہر شخص10 بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھادے۔ ظاہر ہے کہ ان اسیرانِ قریش نے دینی تعلیم نہ دی ہوگی۔ عہدِ اموی میں جب اسلامی مملکت کی سرحدیں وسیع ہو ئیں اور دیگر قوموں سے ربط و تعامل بڑھا تو اس زمانے کے مروّجہ علوم کو عربی زبان میں منتقل کرنے کی تحریک شرع ہوئی۔ یزید بن ابی سفیان کی وفات (م64ھ) کے بعد رواج دیے گئے دستور کے مطابق ان کے بیٹے خالد کو زمامِ اقتدار سنبھالنی تھی، لیکن اس کا علمی شغف اتنا زیادہ تھا کہ اس نے خلافت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ خالد بن یزید نے خود بھی بہت سی کتابوں کا ترجمہ کیا اور دوسروں سے بھی کروایا۔

عالم اسلام میں سیاسی آویزشیں جاری رہیں اور میدانِ سیاست میں کشت و خوں کا بازار گرم رہا، یہاں تک کہ خلافتِ بنو امیہ کا خاتمہ ہوگیا اور خلافتِ بنو عباس قائم ہو گئی لیکن علمی تحریک برابر زور پکڑتی گئی۔ عباسی حکمرانوں: منصور اور ہارون رشید نے اس کی سرپرستی کی، یہاں تک کہ مامون رشید نے اسے بامِ عروج پر پہنچا دیا۔ اس کے عہد میں قائم ''بیت الحکمہ''میں اس دور کے تمام مروّجہ علوم کی کتابوں کا دیگر زبانوں سے عربی زبان میں ترجمہ کیا گیا۔اُس دور میں خلافتِ اسلامی کے حدود میں مدارس کا قیام شروع ہوا تو ان میں علوم کی تقسیم کو روا نہ رکھا گیا۔ ان میں داخلہ لینے والے طلبہ تمام علوم حاصل کرتے تھے

اور بعد میں ذوق کے مطابق کسی فن میں اختصاص کرتے تھے۔تاریخ اسلامی میں دولت سلجوقیہ کے وزیر اعظم نظام الملک طوسی (م485ھ) کے ذریعہ قائم ہونے والے مدرسے کو، جو اس کے نام سے منسوب ہو کر ''مدرسۂ نظامیہ'' کہلایا، غیر معمولی شہرت حاصل ہے۔

امام غزالیؒ(م505ھ) اور ان کے استاد امام الحرمین جوینی (م478ھ) اسی طرح ابن الخطیب(م776ھ)، تبریزی شارح حماسہ(م502ھ)، ابو الحسن فصیحی شاگرد امام عبد القادر جیلانی اور سعدی شیرازی نے اس مدرسے میں تعلیم حاصل کی تھی یا تدریس کے فرائض انجام دیے تھے۔

نظام الملک نے اپنے حدودِ مملکت کے دوسرے حصوں میں بھی مدارس کا جال بچھا دیاتھا۔ علامہ شبلیؒ نے اپنے مشہور مقالہ ''مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم '' میں ایسے مدارس کی ایک طویل فہرست نقل کی ہے جو مسلم حکمرانوں کے دور میں ان کی حدودِ مملکت میں قائم ہوئے۔ نیسا پور، بغداد، ہرات، موصل، اصفہان، ماوراء النہر، بلخ،مرواور خوارزم وغیرہ میں بڑے بڑے مدارس قائم تھے۔علامہ شبلی نے انھیں موجودہ دور کی یونیور سٹیو ں سے تشبیہ دی ہے۔ انھوں نے مصر میں نور الدین زنگی (م569ھ) اور سلطان صلا ح الدین ایوبی (م589) کے زمانوں میں قائم ہونے والے مدارس کی بھی تفصیل پیش کی ہے۔ اس کے علاوہ ایران، ترکی اور اندلس کے مدارس کا تذکرہ بھی تفصیل سے کیا ہے۔

ان مدارس میں دینی اور دنیاوی ہر طرح کے علم کی تعلیم دی جاتی تھی چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ علمائے متقدمین میں بعض ایسے حضرات بھی گزرے ہینجو کسی دینی علم میں بھی مہارت رکھتے تھے اور کسی دنیاوی علم میں بھی۔ مثال کے طور پر الشیخ الرئیس ابو علی ابن سینا (م 438ھ) کی شہرت عظیم طبیب کی حیثیت سے ہے۔ ان کی کتاب' 'القانون فی الطب'' ایک ہزار سال سے طبی نصاب کی اہم ترین کتاب ہے۔ یوروپ کے میڈیکل کالج میں بھی تقریباً 500سال تک داخلِ نصاب رہی ہے۔ اسی کے ساتھ فلسفہ میں بھی انھیں درک حاصل تھا۔ تیسری طرف علم تفسیر میں بھی انھوں نے کئی کتابیں تصنیف کی ہیں۔ علامہ علاء الدین ابن نفیس قرشی دمشقی (م 687ھ) کا شمار بھی مشہور اطباء میں ہوتا ہے۔ نور الدین زنگی اور صلاح الدین

ایوبی کے قائم کر دہ اسپتالوں میں وہ افسر الاطباء رہے۔ اس کے علاوہ وہ عظیم فقیہ بھی تھے۔ قاہرہ کے مدرسہ مسروریہ میں فقہ شافعی کا درس دیتے تھے۔ اس ضمن میں اندلس کے علامہ ابن رشد قرطبی(م 595ھ) کا

تذکر ہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ وہ بیک وقت طبیب بھی تھے،فلسفی بھی اور فقیہ بھی۔ فقہ میں ان کی کتاب ''بدایہ المجتھد''، فلسفہ میں '' تھافت التھافت ''اور طب میں ''کتاب الکلیات''، یہ تینوں اب تک مرجعِ خلائق ہیں اور مشرق و مغرب میں ان سے بھر پور استفادہ کیا جا رہا ہے۔

غیر منقسم ہندوستان میں بھی مدارس کے قیام کی ایک زرّیں تاریخ ہے۔ عہدِ سلطنت میں اور بعد میں مغلیہ عہد میں ملک کے ہر حصہ میں مدارس قائم کیے گئے۔ ان میں تمام مروجہ علوم پڑھائے جاتے تھے۔ ان مدارس کو حکومت کی سرپرستی حاصل رہتی تھی اور ان کا پورا خرچ سرکاری طور پر اٹھایا جاتا تھا۔ ہندوستان سے جب مسلمانوں کی حکمرانی ختم ہوئی اور اس پر انگریزوں کا تسلط قائم ہوا تو ان مدارس پر افتاد پڑی۔ سرکاری امداد سے محروم ہوجانے کی وجہ سے وہ بند ہو گئے۔ انگریزوں نے اپنا نظامِ تعلیم جاری کیا۔ اس کے تحت جو تعلیمی ادارے قائم کیے گئے وہ ظاہر ہے کہ انگریزوں کی ضرورت پوری کر نے کے لئے تھے۔ سیاسی یلغار کے ساتھ فکری یلغار کی بھی زبردست کوششیں کی گئیں اور عیسائیت کو خوب بڑھاوا دیا گیا۔

اس صورت حال نے تعلیم کی دوئی پیدا کی اور دینی تعلیم اور غیر دینی تعلیم کے دھارے وجود میں آئے۔ کچھ مسلمانوں کے ذریعہ ایسے تعلیمی ادارے قائم کیے گئے جو انگریزی حکومت کی ضروریات پوری کر سکیں اور ان کے لئے سول سرونٹس فراہم کر سکیں۔ دوسری طرف ہندوستان میں مسلمانوں کے تہذیبی وجود و بقا کے لئے فکر مند اصحاب نے ان کے لئے خالص دینی تعلیم کے ادارے قائم کیے، تاکہ ارتداد سے ان کی حفاظت ہو سکے اور وہ مسلمان رہتے ہوئے یہاں زندگی گزار سکیں۔علی گڑھ کالج غیر دینی تعلیم کا نمائندہ تھا تو دیوبند کا مدرسہ انھیں دینی تعلیم فراہم کرتا تھا۔ ڈیڑھ سو سال کا عرصہ گزر چکا ہے، انگریزوں کی حکومت ختم ہو چکی ہے، یہ دونوں دھارے الحمدللہ اب بھی متوازی چل رہے ہیں اور اپنی اپنی جگہ خدمات انجام دے رہے ہیں۔

ادھر کچھ عرصے سے مسلمانوں کی سوچنے سمجھنے والی اور ان کی فلاح و بہبود سے دلچسپی رکھنے والی شخصیات میں تعلیم کی دوئی کو ختم کرنے یا کم سے کم دونوں نظام ہائے تعلیم کے درمیان قربت پیدا کرنے کی فکر ہوئی اور اس کے لئے انھوں نے مختلف تدابیر اختیار کیں۔ ایک تدبیر انھوں نے یہ اختیار کی کہ دینی تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کو کچھ انگریزی پڑھادی جائے اور معاشیات، سیاسیات اور کچھ دوسرے مضامین کی شدھ بدھ فراہم کر دی جائے تاکہ وہ عصر حاضر کے تقاضوں سے بالکل اندھیرے میں نہ رہیں اور جدید تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ اپنے دین سے بالکل نا بلد نہ رہ جائیں اس کیلئے صباحی اور مسائی تعلیم ا انتظام کیا گیا۔ اس تعلق سے زیادہ زور اور محنت دینی تعلیم کے اداروں پر صرف کی گئی۔ مدارس کے نصاب کو out of dateقرار دیا گیا،اس کی اصلاح کے لئے زبردست تحریکیں چلائی گئیں، کانفرنسیں منعقد کی گئیں، سمینار اور ورکشاپ کیے گئے، تجویز کردہ نئے نصاب کے مطابق کتابیں تیار کی گئیں۔ دوسری تدبیر یہ اختیار کی گئی کہ دینی مدارس کے فارغین کو جدید مضامین سے واقف کرنے کے لئے خصوصی کورسز شروع کیے گئے۔ اس سلسلے میں ملک کے مختلف حصوں میں متعدد تجربات ہو رہے ہیں۔ یہ تمام کوششیں قابلِ قدر ہیں۔ ان کے کچھ ثمرات بھی ظاہرہو رہے ہیں، لیکن راقم کا احساس ہے کہ ایک طرف دینی مدارس کے طلبہ کو عصری مضامین پڑھانے کے لئے تو خوب کوشش کی گئی، لیکن دوسری طرف جدید تعلیمی اداروں میں داخلہ لینے والے بچوں کی دینی تعلیم کی کمی کو پورا کرنے کیلئے جتنی کوششیں مطلوب تھیں ، وہ نہ کی جاسکیں۔ دینی مدارس میں مسلم آبادی کے زیادہ سے زیادہ 4فیصد بچے تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ ان کی جدید تعلیم کے لئے تو اتنی فکر اور کوشش کی گئی ، لیکن جدید تعلیمی اداروں میں داخل96 فیصد بچوں کو بنیادی دینی تعلیم سے بہرہ ور کرنے کے لئے اس کا عشر عشیر بھی کوششیں نہیں کی گئیں۔